شام اور سائے
وزیر آغا

شام اور سائے
وزیر آغا

حقوق	بحقِ مصنف محفوظ
تعداد	ایک ہزار
طبع	اوّل
ناشر	اے-ایم-خواجہ
مطبع	نامی پریس-لاہور
سرورق	موجد
ماہ وسالِ اشاعت	اکتوبر ۱۹۶۲ء
قیمت	[illegible]

جدید ناشرین، چوک اردو بازار-لاہور

مولانا صلاح الدّین احمد کی یادیں

اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

مصنّف کی دُوسری تصانیف

مسترت کی تلاش

اُردو ادب میں طنز و مزاح

خیال پارے

نظمِ جدید کی کروٹیں

اردو شاعری کا مزاج (زیرِ طبع)

فہرس

نردبان — مجید امجد — ۷

نیا سال ۹
بات ۱۰
میں اور تو ۱۱
گوری اور کالی ۱۲
آوارہ ۱۴
دکھ ۱۶
مسرت! ۱۸
اجڑتا شہر ۲۰
سرپھرا ۲۲
اجنبی ۲۴
مشورہ ۲۶
من و تو ۲۸
عفریت ۳۰
قریب و دور ۳۲
چمکتا لمحہ ۳۳
ملاقات ۳۶
پیار ۳۸
سفر ۴۰
پرانی بات ۴۲
جسم ۴۴
رات ۴۶
چیل ۴۸
جب اور اب ۴۹
فرازِ کوہ ۵۱
آخرِ شب ۵۳
اعراف ۵۴
عکس ۵۶
شام ۵۸

پت جھڑ ۶۰
تہذیب ۶۲
واپسی ۶۴
بُلاوا ۶۶
زندگی ۶۸
عشق ۷۰
دائرہ ۷۱
پیپل ۷۳
بازگشت ۷۵
طلسم ۷۷
اکیلا ۷۸
جنگل ۷۹
نوجوانی ۸۱
بلیک آؤٹ ۸۳
انجام ۸۵
دھرتی کی آواز ۸۷
یاد ۸۹
انسان ۹۱
سرِ راہ ۹۲
تخلیق ۹۴
نئی پود ۹۶
حیاتِ نَو ۹۸
تعاقب ۱۰۰
بے وفا ۱۰۱
رُکنے کے بعد ۱۰۲
ندامت ۱۰۴
ننھے مزدور ۱۰۶
یہ لوگ ۱۰۷
چاپ ۱۰۹
نارسائی ۱۱۱
شبِ یلدا ۱۱۲
نروان ۱۱۴
فن کار سے ۱۱۶
ترتیب ۱۱۸

نردبان

شعر کی تعریف میں لاکھ اصطلاحیں وضع ہوئیں، ساری باتیں درست، لیکن وزیر آغا کی اِن نظموں کو پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا۔ گویا شعر ایک ایسی لطیف علامت ہے، جو ایک زندہ استعارے سے اُبھرتی ہے۔ علامت روحِ نظم ہے اور زندگی کی لہروں سے اُچھلتا ہوا استعارہ اس رُوح کا جسم ہے۔ علامت، ایک کنگرۂ ایواں ہے، تو استعارہ زینۂ اظہار سے نہیں، یہ ایوان و نردبان کی مثال بھی درست نہیں۔ زینہ تو کنارِ ایوان تک اگر رُک جاتا ہے، یہاں کیفیّت ہی دوسری ہے، —— اِن نظموں میں استعارے کے پھیلاؤ کے ہمراہ موضوع کا دائرہ بھی پھیلتا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ موضوع کی حدود، استعارے کی سرحدیں بھی متعیّن کرتی چلی گئی ہیں، —— ایک فکری خلا کو عبور کیا جا سکتا ہے، لیکن بات اظہار کی ہو تو ایک تاثّر کو تمثیل بیان نہیں کر سکتی، جب تک تمثیل، اس تاثّر کو اپنے قالب میں ڈھال نہ لے، کہ تاثّر کے اجزا اور تمثیل کے عناصر ایک ہو کر رہ جائیں اور ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے، کہ اِن میں کائنات کے زندہ و متحرّک مظاہر، اپنے

چہروں سے بوجھل نقاب اُتار کر، میٹھے، سُبک، ملائم، مترنّم لفظوں کی بساط پر اُتر کر جیتے، جاگتے، دھیمی دھیمی سانس لیتے ہوئے خیالوں کا جادو جگا گئے ہیں۔ بات کہیں گہری، کہیں گمبھیر، کہیں چنچل ہے۔ اِس کی لانبی زلفیں سونے کے باریک مہین تاروں کی طرح لہراتی ہیں، آپس میں اُلجھتی نہیں، موضوع نازک ہیں، اَدَق نہیں، اشارے بلیغ ہیں، مُبہم نہیں، علامتیں نکر اندوز نہیں، ژولیدہ نہیں، کہیں بھی تصنّع یا کاوش کا نشان نہیں ملتا۔ کہیں بھی کوئی شعوری اُلجھن، کوئی بناوٹی خیال آرائی قاری کو نہیں کھٹکتی، کسی بات پر کسی بلند بانگ فلسفے کی چھاپ نہیں، ہر آواز ایک مدھم گھلاوٹ میں بدل کر شاعر کے دل کی ایک ایسی دنیا کا پتا دیتی ہے، جہاں کالے سرد پہاڑوں اور رنگین کومل پنکھڑیوں، نیلے مَوّاج سمندروں اور لرزاں، بے بس آنسوؤں کی حقیقتیں احساس کے ایک ہی نرم رَو دھارے پر یکساں بہتی چلی گئی ہیں۔ ہر اظہار کے پیچھے ایک بے خود اور خود آشنا رُوح کی ایک ایسی نکھری ہوئی معصومیت جلوہ آرا ہے، جس میں لطیف جذبوں کی تازگی بھی ہے اور سوچتی دھڑکنوں کی آنچ بھی!۔

مجید امجد

نیا سال

بھیگوں کلیوں کی ٹھنڈی سیج پہ لیٹی ہوئی
صبح — اِک بیتال سونے کا طلسم
صُبح — جیسے تیرا جسم!

بادلوں کی گرزم، بوجھل شال میں لپٹی ہوئی
شام — گہری برف کی بے جان سِل
شام — جیسے میرا دِل!

شام، بجھتی شام تیرے سامنے
صُبح، ہنستی صبح میرے رُو برُو!!

بات

دِل کی بات بہکتے قدموں لب کی منڈیر پہ آئی
تاریکی میں رہی تھی برسوں سورج سے گھبرائی
چندھیائی آنکھوں کو مَل کر، لی اُس نے انگڑائی

لب کی منڈیر سے لگ کر اس نے سُنا انوکھا شور
اور پھر یک دم مُڑ کر اُس نے دیکھا اپنی اَور
ننگی گردن، ننگی باہیں، ننگی اِک اِک پَور

لب کی منڈیر سے ہٹ گئی فوراً نظروں سے شرمائی
سارے عالم پر بے بس سی اِک خاموشی چھائی
پھر نکلی تو بھاری گھونگھٹ جیسے دُلہن آئی

مَیں اور تُو

اِک البیلی پگڈنڈی ہے
افتاں خیزاں، گرتی پڑتی، ندی کنارے اُتری ہے!

ندی کنارے، باہیں کھولے، اِک البیلا پیڑ کھڑا ہے
پیڑ نے رستہ روک لیا ہے
پگڈنڈی حیران کھڑی ہے
جسم چرائے، آنکھ جھکائے
دائیں بائیں دیکھ رہی ہے!

جانے کب سے باہیں کھولے، رستہ روکے، پیڑ کھڑا ہے
جانے کب سے
جسم چرائے، آنکھ جھکائے، پگڈنڈی حیران کھڑی ہے!!

گوری اور کالی

پرندے ابھی چہچہائے نہیں تھے
کہیں کھیت کی مینڈھ سے کوئی سایہ
لپک کر گھنی جھاڑیوں میں چھپا بھی نہیں تھا
ابھی آسماں، تھال میں زرد کلیاں سجائے
ہوا کے سُبکبار جھونکے سے اُلجھا نہیں تھا
سیہ چادرِ شب کے کونوں پہ بھاری سے پتّھر رکھے
خامشی جاگتی تھی!
لرزتی ہوئی اوس کی بُوند
جانے کہاں سے ٹپک کر
دمکتا ہُوا ایک موٹا سا آنسو بنی

رات کی آنکھ میں تیرتی تھی
عجب روشنی تھی!

اور اب مسکراتی سحر اپنے چمکیلے ریشم کے گچھوں سے
سہمی ہوئی رات کی مشکیں باندھے کھڑی ہے
اُجالے کے اندھے نگر میں
لرزتے ہوئے سرخ ہونٹوں سے رِستا لہو پونچھ کر
ہنس رہی ہے
عجب تیرگی ہے!!

۱۲

آوارہ

ہوا کی منزل کہیں نہیں ہے

ہوا کی منزل کہیں نہیں ہے
کبھی سرِ کوہ اس کا مسکن
کبھی سمندر کی ہم نشیں ہے
ہوا کی منزل کہیں نہیں ہے

ہوا — کبھی تند و تیز طوفاں
ہوا — کبھی اِک نسیمِ خنداں
کہیں بجھائے ہزاروں دیپک

کہیں منوّر کرے خیاباں
پہاڑ، صحرا، چمن، بیاباں
کبھی کہیں ہے کبھی کہیں ہے
ہما کی منزل کہیں نہیں ہے

دُکھ

تب ہاتھ کی گرفت سے ہر شے نکل گئی
کھمبا، منڈیر، شاخ، لرزتا ہُوا شجر
اور آسماں پہ نقرئی بادل کا ایک پَر
مُٹھی نحیف غُنچے کی مانند کُھل گئی
اور ہاتھ کی گرفت سے ہر شے نِکل گئی!
کُندن سی باہیں شام کی یکبارگی اٹھیں
اِک چیخ تھی کہ کالے پہاڑوں تلک گئی
اور شام جیسے رات کے ساگر میں گُھل گئی!

تب رات خوشبوؤں میں نہائی ہُوئی اُٹھی

نغمے کی گونج سانس کے سرگم میں مل گئی
گردوں سے چند اوس کی بوندیں ٹپک پڑیں
تاروں کی ہانپتی ہوئی بارات ڈھل گئی
بوڑھی گلی میں دھیرے سے چپ خیمہ زن ہوئی
کھڑکی کی آنکھ کیا بجھی، دنیا بدل گئی
دُکھ اوٹ سے کواڑ کے میری طرف بڑھا
بھیگی ہوئی نظر سے مجھے گھورنے لگا!

مسرّت!

درختوں کے نیچے
کوئی — زرد پتّوں، جلی کونپلوں
ادھ کھلی خشک کلیوں کی چادر بچھائے
ترا منتظر ہے!

بتا کون ہے یہ؟
جو اِن گنگ ہونٹوں، بجھی بند آنکھوں
جلے سرد ہاتھوں کے ہوتے ہوئے بھی
ترا منتظر ہے!

بتا کون ہے تو؟

کہ اِن زرد پتّوں، جلی کونپلوں
ادھ کھِلی خشک کلیوں کی چادر پہ اکثر
ترے نرم قدموں کی موہُوم آہٹ
اُبھرتی ہے —— پھر ڈوبتی ہے اُبھر کر

بتا کون ہے تُو؟
کہ یہ دل ازل سے تجھے جانتا ہے
تجھے تیری آہٹ سے پہچانتا ہے!!

اُجڑتا شہر

سیہ رُو قلندر
عجب بے نیازی سے لوہے کا لمبا سا چمٹا بجائے!

کبھی کوئی تانگے کا گھوڑا، دہکتے ہوئے تیز چابک سے ڈر کر
کسی گرم، چکنی سڑک پر ذرا لڑکھڑائے۔
تو اِک نقرئی قہقہہ، چیخ میں ڈوب جائے!

کبھی چہچہاتے ہوئے ننھّے بچّوں کی ٹولی
پرانی سی اِک بس کے پنجرے سے نِکلے
گلی کے گھُٹے مُنہ میں چپکے سے اُترے

اُدھڑتی ہوئی اِک عمارت کے اندر پہنچ کر معاً ٹوٹ جائے!

کبھی کوئی ریلا لُڑھکتے ہوئے سائیکلوں کا
کسی کالے دھبّے سی منزل کو بڑھتا ہی جائے!
کبھی تیز رفتار موٹر کے یک دم ٹھہرنے
بریکوں کی اِک کرب انگیز سی چیخ کے لاکھوں ٹکڑوں میں بٹنے کی
آواز آئے
کبھی چوک کی ایک صدیوں پرانی، نم آلود کھڑکی کی چوکھٹ پہ
تھوڑی سی ٹِکائے
کوئی زرد چہرہ — پھٹی سرخ آنکھوں کے زندان میں
بے قراری سے پھرتی ہوئی پتلیوں کا تماشہ دکھائے
تماشہ مگر کون دیکھے؟
کبھی تم جو دیکھو تو اِن پتلیوں کے سمندر میں
اِس ٹوٹے پھوٹے ہوئے آئینے میں
تمہیں اپنی بکھری ہوئی ریزہ ریزہ ہوتی ذات کا اِک ہیولے
اُبھر کر بُلائے
اُجڑتے ہوئے شہر کا ایک منظر دکھائے!!

سرپھرا

جلے خشک پتّوں
کڑی دھوپ میں گھاس کے سُوکھے تنکوں،
اُدھڑتی ہُوئی کول کی گرم سڑکوں کے بکھرے ہُوئے
سنگ ریزوں میں، رو بیَد گی ڈھونڈتے ہو
عجب آدمی ہو!

دُکھی شام کے ہانپتے، کانپتے جُھٹپٹے میں
کِسی کالے انجن کی دلدوز چیخوں کو سُن کر
سیہ آہنی ریل کے پُل پہ جُھک کر
بڑے غور سے ہر گزرتے مسافر کو تم گھُورتے ہو

عجب آدمی ہو!

بجھی رات کی بے صدا خامشی میں
کوئی — چاند کی زرد قندیل لے کر
شکستہ مکانوں، تھکے راستوں،
ٹوٹی پھوٹی ہوئی خندقوں میں
کسی بیتے لمحے کو جب ڈھونڈتا ہے
تمہیں دیکھتا ہے
تو تم — دفعتاً
اپنی چُندھیائی آنکھوں پہ ہاتھ اپنے رکھ کر
بگڑ کر
بڑے زور سے، کرب سے، چیختے ہو
عجب آدمی ہو!!

اجنبی

اُون اُتری بھیڑ کے مانند پیڑ
منہ چڑاتی، دل دُکھاتی، چوٹیاں
دُور نیچے پتھروں کی سیج پر
سر پٹختی، چیختی، ندّی رواں

آسماں پر مُردہ بادل، خیمہ زن
قہقہوں سے رعد کے نا آشنا
مہر جیسے کوئی مجبورِ ازل
ایک میلے جال میں اُلجھا ہُوا

ملگجی سی روشنی میں ایک پیڑ

کانپتی اُنگلی سے مجھ پر خندہ زن
آسماں پر دائرے کے رُوپ میں
چیختے، روتے ہوئے بھُوکے پرند
دم بہ دم غوطہ لگاتے میری اُور
دم بہ دم مجھ پر جھپٹتے مُردہ خور

مشورہ

کبھی اونچے پیڑوں کے جنگل میں
پتّوں کی موٹی سی تہہ پہ قدم رکھ کے دیکھو
کبھی بوکھلائی ہوئی ندیوں کے کناروں پہ
اُن تند آنکھوں کو گھورو
جو شاید ازل سے تمہیں گھورتی آرہی ہیں!
کبھی جھاڑیوں سے
کسی اژدہا کے کھلے منہ میں جاتے ہرن کی
وہ دلدوز چیخیں سنو جو ابد بن چکی ہیں!
ذرا اپنے تن پر سیہ خوف کی سرد انگلی کو پھرنے تو دو
تم — ذرا لمحہ بھر کے لئے رال میں لتھڑے ہونٹوں پہ

اک چیخ بن کر رکو — رک کے دیکھو!

ہوا — خشک پتوں، پھلوں، بوٹیوں
مردہ پھولوں کی بو سے، کچھ اس درجہ بوجھل ہے، چلتے ہوئے ہانپتی ہے
کبھی اس کی کڑوی کسیلی تمازت سے نتھنوں کو تم آشنا تو کرو
کبھی اس بھیانک سیہ موت کا سامنا تو کرو
کبھی اونچے پیڑوں سے
پتوں کے اس فرش پر تم گرو — گر کے دیکھو
کبھی میری دم توڑتی چیخ میں
اپنی تازہ، غم آلود چیخیں ملاؤ
کبھی اونچے سنسان پیڑوں سے اترو
مرے پاس آؤ!!

مَن و تُو

چار سُو اِک بحرِ ناپیدا کنار
سینۂ لرزاں پہ جس کے بے قرار
موجۂ طوفاں، ہوائے شعلہ بار
ناتراشیدہ امنگوں کی جلن
سینۂ سوزاں میں پیہم اِک لگن
ہُو بہو میری طرح!

اِک جزیرہ، خامشی سے ہم کنار
زرد کلیوں، سُرخ پھولوں کا دیار

نو دمیدہ آرزوؤں کی بہار
صد حجاباتِ حسیں کی انجمن
ہجر کی آشفتگی پر خندہ زن
ہو بہو تیری طرح !

عفریت

یہاں ـــ خشک ندیوں کی سوکھی زبانیں
بجھی بانجھ دھرتی کی چھاتی سے چمٹی ہوئی ہیں
برہنہ درختوں کے نیچے
ہزاروں کی تعداد میں سوکھے پتے
اندھیرے کی ننگی نگاہوں سے ڈر کر
عجب بے بسی سے
خنک ریت کی میلی چادر پہ اوندھے پڑے ہیں!

مری ڈوبتی سانس کہتی ہے مجھ سے
کہاں ہے ترے تن کی اندھی گپھا جس سے تو آشنا تھا؟

کہاں ہے تری ذات کا وہ اندھیرا
جسے تو نے اندھی گپھا میں مقیّد کیا تھا ؟
جسے بے نشاں سی "مسافت" کا طعنہ دیا تھا !
وہ گُم سُم اندھیرا
دھوئیں کا وہ بے نام دھبّہ
کسی بند جادو کی بوتل سے باہر نکل کر
بجھی بانجھ دھرتی کی صورت
تری کور آنکھوں کے آگے اگر آج پھیلا ہُوا ہے
تو یہ تیری اپنی خطا ہے !

عجب ماجرا ہے
اندھیرے کی ننگی نگاہیں مجھے گھورتی ہیں
بجھی بانجھ دھرتی کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہوں !!

قریب و دُور

یہ قُربت ! ، یہ دُوری !
جو سوچو تو ہے دُور تاروں کا عالم
جو دیکھو تو شبنم کی صُورت سحر دم
کبھی گُل کی پتّی پہ کچھ سیم پارے
کبھی بجھتی آنکھوں میں کچھ اشکِ پیہم !

یہ قربت ! یہ دُوری !
جو پلکیں اٹھاؤ تو اِک قُربِ باہم
جو پلکیں گراؤ تو اِک ہجر کا عالم
وہی آرزوؤں کے بجھتے شرارے
وہی دل ۔۔ وہی دِل کا صحرائے اعظم !

چمکتا لمحہ

چمکتے ہوئے تند لمحے کی زد سے تو کب بچ سکے گا!
یہ چمکیلا لمحہ کہ تیرے عقب میں ازل سے رواں ہے
تجھے روند کر یوں بڑھے گا کہ جیسے
پرِ کاہ سے مختلف تو نہیں ہے!

لچکتے ہوئے سرو زینے پہ پاؤں رکھے
تو ــــ کسی ایسی منزل کی جانب رواں ہے
جہاں اس لپکتے ہوئے تند لمحے کی زد سے اماں ہے

مگر ایسی منزل کہاں ہے ؟

یہ لمحہ کہ خود اَنگنت ساعتوں سے مرتب ہُوا ہے
یہ لمحہ کہ صورت بدل کر شب و روز میں ڈھل گیا ہے
شب و روز اِک دوسرے کے تعاقب میں بڑھتے
مہ و سال کی ایک لمبی سی مالا بنے ہیں
وہ مالا تری نرم گردن میں اِک طوق سا بن کے اب جھُولتی ہے ۔
یہ لمحہ ـــ یہ سیمابی چمکیلا منکا
لپک کر تری لمبی مالا کے حلقے میں آتا ہے جس دم
تو مالا کا بڑھتا ہُوا بوجھ، گردن کو تیری
زمیں بوس ہونے پہ مجبور کرتا ہے ـــ اور تو
بڑی بے بسی سے
تعاقب میں آتی ہوئی موت کو دیکھتا ہے
لچکتا ہوا سرو زینہ مثا بولتا ہے
ترا ہاتھ لکڑی کی باہنوں سے یکدم پھسل کر
ترے لڑکھڑاتے ہوئے جسم کو تولتا ہے
مگر کون جانے تجھے کیا ہوا ہے

تو اِک بھیگی گٹھڑی بنا سرد زینے کے قدموں میں دم توڑتا ہے
ٹپکتا ہوا تند لمحہ تجھے روند کر ایسے بڑھتا ہے جیسے
پرِ کاہ سے مختلف تو نہیں ہے!!

ملاقات

پوَن چلی
اور شب کی کنواری گھاس کے آنسو بکھر گئے
نرم، ملائم آنچل پر شبنم کے موتی لرز گئے
سبز گپھا میں، گُم سُم بیٹھے
پھول ایسے نازک پنچھی کے
پنکھ سنہری ڈول گئے!

پوَن چلی
کچھ ہولے ہولے، خود سے لجاتی
ہر کھٹکے پر رک سی جاتی

ننگے پاؤں، شب کی کنواری — گھاس پہ چلتی
پیڑ کے نیچے آن رُکی

پیڑ کے نیچے
تنہائی کی گھور گپھا میں تم بیٹھے تھے
تھکی تھکی پلکوں سے تمہاری
اوس کے موتی چھٹے تھے
یُوں رُکی — سب بکھر گئے!!

پیار

پیار کے کچّے دھاگے ہیں اب کون پروئے دل
آیا جھونکا، ٹوٹا دھاگا، بکھر گئی محفل
بچھڑ گئے سب سنگی ساتھی، ڈوب گئی منزل

کون کسی کا دامن تھامے، کون کسی کا میت
شبنم ایسے کچّے رشتے، بادل ایسی پریت
پل بھر برسیں نین رسیلے، پل بھر کا سنگیت

شام چِتا میں سورج کی، کیوں اپنا انگ جلائے
رات بچاری کس کی خاطر تارے گنتی جائے
پیار کے رشتے کچّے دھاگے، پیار سے ہم بھر پائے

دُکھ کی ڈور سے بندھا ہُوا ہے یہ سارا سنسار
روتی شبنم، روتا بادل، نینوں کی بچھوار
دُکھ جیون کا ساتھی سنگی، دُکھ سے ہم کو پیار

سفر

تھکا ماندہ بے جان بادل کا ٹکڑا
درختوں، چٹانوں سے دامن بچاتا
پہاڑی کے کوہان سے نیچے اُترا

بہت تھک چکا تھا
ہزاروں برس کی مسافت
ہزاروں برس تک بس اِک دُھن مسلّط
بڑھے، آگے بڑھ کر
پہاڑوں، درختوں، نکیلی چٹانوں
ہوا کی نہتی، سِسکتی ہوئی
کرب میں ڈوبی چیخوں کو

مٹھی میں لے کر، مسل کر
بڑی سادگی سے ہنسے، مسکرائے!

وہ دھن اب کہاں ہے؟
وہ ننھی سی، معصوم سی مسکراہٹ
خمیدہ لبوں سے پھسل کر
حسیں اوس کے شوخ قطرے کے مانند
اب خاک پر گر چکی ہے
تھکا ماندہ، بے جان بادل کا ٹکڑا
درختوں، چٹانوں سے دامن بچاتا
پہاڑی کے کوہان سے دم بہ دم
گہرے پُر ہول کھڈ میں اگر جا رہا ہے
تو کیا ہے؟!

یہ بادل کا ٹکڑا! بہت تھک چکا ہے
بہت تھک چکا ہے!!

پُرانی بات

کسی مضمحل شام کے جھٹپٹے میں
بہت دُور جاتا ہوا کوئی پنچھی
کسی دم بخود پیڑ کو اپنا مسکن بنائے
تو اُس پیڑ کی نرم، لچکیلی شاخیں
بگڑ کر، بُرا مان کر، کسمسائیں
گھنے سرد پتّوں میں دبکے ہوئے شب کے باسی
بڑے زور سے چیخ کر پھڑپھڑائیں
سنبھلنے لگیں اور سنبھلنے نہ پائیں
اگر کوئی پنچھی کسی شام کے جھٹپٹے میں —

مجھے دُور جانا ہے میں جا رہا ہوں

میں پنچھی نہیں ہوں کہ اِک پل کے سُکھ کے لئے
تیری پھُولوں بھری نرم آغوش کو اپنا مسکن بناؤں
زمانے کو
تیری بھری بزم کے کسمساتے
بڑے زور سے چیخ کر پھڑپھڑانے کا منظر دکھاؤں
مجھے دُور جانا ہے میں جا رہا ہوں

جسم

میں نرم خوشبو کا ایک پیکر
ہوا کے جھونکے کا ہم سفر تھا!

قدم قدم پہ
گلوں کی تیز اور نشیلی خوشبو
کسیلی جھیلوں کی گرم گہری سی باس جس میں نمی گھلی تھی
گھنیرے جنگل کا لمس جیسے دلہن کوئی عطر میں بسی تھی
سسکتے، روتے مہیب شہروں کی بو کہ جس سے
پرانے "مندر" میں روشنی تھی،
وہ تیز خوشبو، وہ تیز بدبو،
قدم قدم پہ

ہوا کے جھونکے کی ٹھوکر وں سے اُچک کے کیوں مجھ کو دیکھتی تھی
مرے سراپا میں ایسے گھُل مِل رہی تھی جیسے
ازل سے ہم جنس وہ مری تھی !

میں نرم خوشبو کا ایک پیکر
ہوا کے جھونکے کا ہم سفر تھا
اور اب میں بوجھل سی گرم خوشبو میں
گرم بدبُو میں ڈھل چکا ہوں
میں آج اِک جسم بن چُکا ہوں !!

رات

رات سجا کر لائی ہے اک تھال میں پھول ہزار
سچّے موتی، کچّی کلیاں اور کلیوں کے ہار
بھینی بھینی باس کی زد میں آیا سب سنسار

رات سجا کر لائی ہے اِک تھال میں دیپ ہزار
ہاتھ رنگیلے، ہونٹ دہکتے، گال کا رنگ انار
روشن ماتھے کی کرنوں نے چھیڑے دل کے تار

رات سجا کر لائی ہے اِک تھال میں دیپ ہزار
زخمی تارے، گھائل سپنے، شبنم کے اسرار
دُکھ کے زرد، نکیلے کانٹے ہوئے جو دل کے پار

چیل

کمرے کی اکلوتی آنکھ سے باہر جھانکو
گول کی بھیگی سڑکیں دیکھو

گردمیں لپٹی، چڑیوں کی بے کل آواز میں
اپنے لرزتے، کانپتے ہونٹوں کی آواز ملاؤ
دیکھو بستی جاگ اٹھی ہے

شیشم کی چوٹی پر بیٹھی
چیل —— مڑی ہوئی چونچ سے اپنی
اُلجھے پنکھ سنوار رہی ہے
اوپر، پھیکے صاف فلک پر
چمنی کا بل کھاتا دھُواں اِک دھبّہ بن کر

جُھک سا گیا ہے
دھبّے کے پنجوں سے نکل کر
چیختے، ہنستے طوطوں کی اِک ڈار کہ یک دم سہم گئی ہے
جامن کے اِک جھنڈ پہ گر کر ختم ہوئی ہے

تم بھی جاگو
تم گن میٹھے، سندر سپنوں میں غلطاں ہو
آنسو کی باریک ردا سے جھانک کے دیکھو
بستی پنکھ سنوار رہی ہے۔

جب اور اب

دِل — لاکھوں آوازوں کا اِک گہوارہ تھا
نئی نویلی، سجل، رسیلی آوازوں کا اِک جھرمٹ تھا
بھور سمے جب باؤ چلتی، ننھے پنچھی مل کر گاتے
آشاؤں کے پٹ کھل جاتے
پھول سا دِل لہراتا
دھوم مچاتا
ایک چھریرا، بانکا نغمہ، دُنیا پہ چھا جاتا!

اور اب دُنیا!
لاکھوں آوازوں کا اِک گہوارہ ہے

جسم چراتی چاپ بھی ہے اور دِل دہلاتی گونج بھی ہے
اور چیخیں ــــ تیز، نکیلی چیخیں
گھائل چیتے کی سی چیخیں
وقت کے اُڑتے دامن میں اب پنجے اپنے گاڑ رہی ہیں
ہر جانب اِک شور بپا ہے
آوازوں کی اس برکھا میں
دل کی اب آواز کوئی سُنتا ہی نہیں ہے
اِس اُجڑی نگری میں کوئی رُکتا ہی نہیں ہے

فرازِ کوہ

دیکھا فرازِ کوہ سے میدان کی طرف
شطرنج سی بچھی ہوئی آئی ہمیں نظر،
کھیتوں میں دھوپ چھاؤں کا پیکار چار سو
خاکِ وطن بٹی ہوئی ٹکڑوں میں سر بسر
قبروں کے ڈھیر، ملبے کے انبار جا بجا
نیزوں کی طرح اکڑے ہوئے آہنی شجر
مغرب سے آفتابی شعاعوں کی برچھیاں
مشرق میں سہما سہما ہوا مضمحل قمر
ہر سمت، اِک کشاکشِ پیہم میں مبتلا

جنگل کے پیڑ، شہر کے باسی، اُداس گھر!

جب تک فرازِ کوہ سے دیکھا نہ تھا ادھر
برہم تھے ہم، نہ تھی ہمیں اس بات کی خبر
شطرنج کی بساط بچھی ہے زمین پر

آخرِ شب

شبِ زمستان کا سرد دامن
وہ سرد دامن کہ نرم کہرے میں ڈھل گیا ہے
ہر ایک شے کو نگل گیا ہے!

ڈھلک گئی ہیں خموش پیڑوں کی گیلی باہیں
بکھر گئے ہیں زمیں کی تربت پہ زرد پتّے
ٹپک رہے ہیں لرزتے آنسو شبِ زمستاں کی چشمِ تر سے!

کوئی نہیں ہے!
یہ جسم بھی اب تو اجنبی ہے
مگر شکستہ، نحیف و بے بس، اُداس راہوں پہ چل رہا ہے
سفید کہرے میں ڈھل رہا ہے!!

اعراف

کہیں دُور ہنستی ہوئی برف کی پتّیاں
سُرخ بادل کے چھتنار سے ٹوٹ کر
سبز کھیتوں، منقّش چھتوں، جگمگاتی ہوئی شاہراہوں کو
اِک پل میں ڈھانپیں،
مُلائم، مہکتے ہوئے جسم پر اپنی رنگت نچھاور کریں
خون تک کو ٹھٹھرنے پہ اکساتی جائیں!

کہیں دُور — دھرتی کی پچکی ہوئی جلد سے
کالے گنجان جنگل نکل کر
ہر اِک چیز کو اپنے سایوں سے ڈھانپیں
بپھرتی ہوئی ندیوں، وحشی آنکھوں، دھوئیں کے سندیسوں کو

کالی ردا میں چھپائیں
بڑی دُور تک اپنی پرچھائیوں سے
انوکھا سا اِک خوف پھیلاتے جائیں
گھنے گہرے پتّوں میں دبکے ہوئے جسم پر کالی رنگت نچھاور کریں
خون کے کھولنے کا تماشا دکھائیں

مری سمت دیکھو جہاں میں کھڑا ہوں
نہ بادل کا چھتنار مجھ پر کبھی خوب رُوپتیاں پھینکتا ہے
نہ جنگل کی کالی رِدا ہی مجھے ڈھانپتی ہے
مرے چاروں جانب
ہر اک چیز مٹیالی رنگت میں کھوئی ہُوئی ہے
لہو منجمد ہے
فضا پر بجھی گرد کا سائباں ہے
زمیں ایک پھیلا ہُوا خاکداں ہے۔

عکس

آسماں ہے اِک ردائے نیلگوں
اِک ردائے نیلگوں اور ابر کے ٹکڑے ہزار،
ابر کے ٹکڑوں کے نیچے، اِک اکیلا کوہسار
مہر برلب — سوگوار!

کوہ کے قدموں میں اِک جوئے رواں
سبز مخمل کی حسیں مسند پہ بل کھاتی ہوئی
کوئی ناگن رینگتی، پھنکارتی، جاتی ہوئی
جاتی ہوئی — دیوانہ وار!

تُند خُو جوئے رواں کے پاس کھیتوں سے اُدھر

بھیگے پنچھی کی طرح سہما ہوا ننھا سا گھر
گھر کی چھت پر ایک پیکر منتظر — وقتِ سحر
منتظر — اور بے قرار!

کوئی جھانکے اس حسیں پیکر کی آنکھوں میں اگر
نیلگوں پردوں پہ دیکھے ابر کے ٹکڑے رواں
عارضِ سیمیں پہ بہتی آنسوؤں کی ندّیاں
ندّیاں — بے اختیار!

شام

شام نے پر پھیلائے
کالے کلوٹے چمگادڑ، درزوں سے باہر آئے
شام نے پر پھیلائے!

سورج کا رتھ پچھم کے کیلاش سے جا ٹکرایا
اِک شعلہ سا بھڑکا اور پھر چھایا ہی چھایا
لُٹتے لُٹتے لُٹ گئی آخر، دھرتی کی مایا

کلس، منڈیریں، گنبد، چھجے، دیواریں، میدان
چھِن بھر کو پگھلے سونے میں سب کا تھا اشنان

اس کے بعد کہاں کی مایا اور کیسا نروان!

شام نے پر پھیلائے
پھیکے، باسی ہار دکھوں کے، رستوں پر بکھرائے
شام نے پر پھیلائے!!

پَت جھڑ

پت جھڑ کی رُت بھی کیسی ہے
ہر شے جیسے ہار چُکی ہے
چُپ کی ڈور میں ایک اِک پنچھی
بندھا ہُوا بے بس قیدی ہے
ننگی شاخیں مہر بہ لب ہیں
کبڑے پیڑ نے جاں دے دی ہے
پھٹی پھٹی نظریں ہیں ہر سُو
ہر جانب دیوار کھڑی ہے
کس کو ڈھونڈیں، کس کو پائیں

گہری، گھائل خاموشی ہے!

پت جھڑ کی بھی کیسی رُت ہے
چُپ ہے جیسے کوئی کھنڈر ہے
چونکاؤ تو ہر بُنِ مُو میں
ذوقِ نمُو ہے رقصِ شرر ہے
ذرّہ ذرّہ ایک نگر ہے

تہذیب

چمکتے ہوئے قمقمے بجھ گئے دفعتاً

چاند غوطہ لگا کر

گھنے تُند بادل کے سینے میں اُترا

نم آلود غاروں، سیہ گھاٹیوں سے پُراسرار سائے

ہزاروں برس کی تجلّی سے چندھیائی آنکھوں کو ملتے

سیہ موٹے ہونٹوں پہ کالی سی اِک مسکراہٹ سجائے

خنک، تیز جھونکوں کے مانند

لہرا کے اُٹھے

چٹانوں سے کودے

درختوں سے، کھمبوں سے اُترے

جھکی ٹین کی چھت سے پھسلے
بجُھی رہگذر پہ ہر اِک سمت ناچے
بھیانک سا اِک قہقہہ بن کے چیخے
سیہ ناخنوں ، لمبے دانتوں ، مُڑے تیز پنجوں سے ہر شے پہ جھپٹے
کبھی اِس سے لپٹے ، کبھی اُس سے لپٹے
بڑی دیر تک تُند بادل کی صورت گرجتے پھرے !

بجُھے قہقہے جل اُٹھے دفعتاً
رہگذر پر کوئی ایک سایہ بھی باقی نہیں تھا
وہاں تھے — خنک چاندنی کی رداؤں میں لپٹے
حسیں ، نرم ، نوخیز باتوں میں کھوئے
ہزاروں ہی پیکر
بڑے خوبصورت !
بڑے خوب سیرت !!

واپسی

دوپہر کجلا گئی !

کھوئی کھوئی سی فضا میں ایک پیڑ

پیڑ کے نیچے ملائم سبز گھاس

گھاس پر ہم، نیم وا آنکھوں کے ساتھ،

دیر تک سنتے رہے بھونروں کے گیت

دیر تک سونگھا کئے پھولوں کی باس

پیڑ پہ پتّوں کے لاتعداد گھر

اور گھروں میں جابجا نورانی ذرّہ

ایک اک ذرّہ سے آتی کرن روشنی

سیم گوں پوَروں سے ہم کو چھیڑتی
اور ہم ــــ بے ساختہ کروٹ بدل
چھاؤں کے ٹھنڈے جزیرے کی طرف
قہقہوں کی ناؤ میں ، جاتے نکل!

ناگہاں وہ دوپہر کجلا گئی
چیختے ، پھنکارتے جھونکے بڑھے
دِل گرفتہ پیڑ کے پتّے گرے
روشنی کے بجھ گئے سارے دیئے
قہقہوں کا شور ، گُل کی گرم باس
ناچتے ہنستے ہوئے بھونروں کا راگ
خاک پر لیٹی ہوئی محجوب گھاس
گرد کے کہرام میں سب کھو گئے
راستے دو ــ پھوٹ کر گم ہو گئے!!

دوپہر کجلا گئی!
ایک اندھی نیم جاں، اُکھڑی سی شام

سُونی یادیں ، بیتے لمحے ، پوٹلی میں باندھ کر
لڑکھڑاتی ، ہانپتی — آگے بڑھی
پیڑ کے تن سے لپٹ کر رو پڑی !!

بُلاوا

ریشم سی کومل پتّی سے آنسو پونچھے اوس
پَو پھٹتے ہی دل ڈوبے جب ابھریں کالے کوس

راہ کٹھن ہے اور رستے کے کانٹے ہیں غم خوار
پگ پگ دامن کھینچ کے پوچھیں: کہاں چلے ہو یار؟
پتّھر ٹھوکر کھا کر بولیں، اِک پَل یہاں گزار
جنگل ہنسی اڑائیں اِتنی، چلنا ہو دشوار

راہ کٹھن ہے اور منزل سے آتے ہیں پیغام
تیرا رستہ تکتے تکتے ہم نے صبح سے کی ہے شام

زندگی

کبھی سرد جھونکے کو صحنِ چمن سے
بہکتے ہوئے، لڑکھڑا کر گزرتے ہوئے تم نے دیکھا ؟
وہ اِک سرد جھونکا کہ جس کے در آتے ہی
رستوں پہ بکھرے ہوئے زرد پتّے
تھرکنے، مچلنے، تڑپنے لگے ہوں :

یہ رستوں پہ بکھرے ہوئے زرد پتّے
یہ پامال لاشے
درختوں کے، پھولوں کے، یادوں کے لاشے

کبھی زرد پتّوں کو، پامال لاشوں کو، از خود تھرکتے ہوئے تم نے دیکھا؟

اگر بات یہ ہے
تو پھر سرد جھونکے کے چلنے، تھرکنے
چمن سے گذرنے کو تم کیا کہو گے؟

یہ اِک سرد جھونکا جسے تم نے آوارہ پنچھی کہا ہے
یہی زندگی ہے
اسی سرد جھونکے سے دنیا بنی ہے!

عشق

اِک پتھریلی چُپ نے سینہ تان لیا !
دل نے دستک دے کے کہا : پہچان لیا ؟
یہی ہے تیری منزل ، تُو نے جان لیا ؟

منزل بھی یہ کیا منزل ہے ، سانس نہ لو
بات کرو پر بات کے ساتھ آواز نہ ہو
موتیوں ایسے نیر گریں ، جھنکار نہ ہو

ہنستی چال ! چہکتی چھاگل ! ہوش کرو
دِل پاگل ہے ، پاگل کی مت بات سُنو
اس گہرے سناٹے میں خاموش رہو

دائرہ

حسیں ابر پارو!
تھرکتے ہوئے تم سدھارو
کسی سینہ تانے ہوئے کوہ کی چوٹیوں کو!

جواں کوہسارو!
ذرا کھول دو اپنا آغوش امشب
یہ کچھ ابر پارے، مصیبت کے مارے
جنہیں ریگِ صحرا نے ٹھکرا دیا ہے
بسر رات کرنے چلے آرہے ہیں

حسیں مرغزارو!

ذرا صبر کرنا کہ کچھ ٹھٹھرے مہماں
کسی سنگ دل میزباں کی درشتی پہ آنسو بہاتے
تمہارے جواں سبز و شاداب کھیتوں پہ گوہر لُٹاتے
اِدھر سے گذرتے ہوئے جا رہے ہیں!

شگفتہ گلو!
دیکھنا دوسروں کی امانت ہیں گوہر
جنہیں تم سمجھتے ہو اپنا تمہارے نہیں ہیں
یہ تابندہ موتی جنہیں تم رُلاتے ہوئے ہنس رہے ہو
ابھی پل میں تم سے جُدا ہو رہے ہیں!

منوّر شعاعو!
مگر روشنی تیز تر کرتی جاؤ
یہ تابندہ موتی ہیں بادل کے ٹکڑے
یہ بچھڑے ہوتے ہیں کسی کارواں سے
انہیں کارواں تک ذرا لیتی جاؤ!

پیپل

اِک پیپل کے نیچے مَیں نے اپنی کھاٹ بچھائی
لیٹ گیا میں کھاٹ پہ لیکن نیند نہ مجھ کو آئی
آہیں بھرتے، کروٹیں لیتے، ساری عمر گنوائی

پیپل کے پتّوں کو گِنتے، کرتے اِن پر غور
پیپل کی شاخوں کو تکتے بیت گیا اِک دَور
پیپل کی ہر چیز پرانی، البیلا ہر طور

چلے ہوا تو ڈالی ڈالی، لچک لچک بل کھائے
رُکے ہوا تو سادھو بن کر دھیان کا دیپ جلائے

جھکڑ کے ہر وار پہ ڈولے، چیخ چیخ رہ جائے

پیپل کی شاخوں پر بیٹھے کچھ پنچھی سستائیں
باہر سے کچھ آنے والے اِک کہرام مچائیں
گائیں گیت انوکھے مِل کر ناچیں اور نچائیں

پیپل کیا ہے؟ — جوگی کا بے در سا اِک استھان
جھونکے، پتے، پنچھی، انساں، سب اس کے مہمان
کھاٹ پہ لیٹا سوچ رہا ہوں، میں، مورکھ — نادان!

بازگشت

کھڑی رہو!
گذر رہا ہے کارواں
بساطِ آسماں پہ ہیں حسیں تھرکتی بدلیاں
کوئی یہاں، کوئی وہاں
وہ — دُور، نیچے رہگذر پہ رینگتے ہوئے جواں
کہ جیسے مورِ ناتواں کا قافلہ رواں دواں!

کھڑی رہو!
کھڑی رہو کہ کھُل گئی ہیں بند تھیں جو کھڑکیاں
روش روش سے آ رہی ہے اب ہوائے گلستاں

مہک اُٹھا ہے ناگہاں
دلِ غریب و خونچکاں
مگر سُنو! یہ چاپ کس کی آ رہی ہے بے گماں؟

کھڑی رہو!
ڈرو نہیں، وہ چاپ کھو گئی کہیں
نہیں! — وہ نیچے رہگذر پہ دیکھ لو کوئی نہیں
فلک پہ زرد بدلیوں کا بھی کوئی نشاں نہیں
وہی ہے صاف آسماں، وہی ہے سنگ دل زمیں
کھڑی رہو — ڈرو نہیں!!

طلسم

آدھی رات کا سناٹا ہے جیسے کوئی طلسم
سُونی راہیں، گُم سُم گلیاں، پاؤں کی زد میں جسم

گونگے شہر کے اس مرقد میں ہر شے دبک گئی
اپنے ہی سائے سے ڈر کر، خود میں سمٹ گئی
سوئی منڈیریں، چُپ دیواریں، دروازوں پہ قفل
سناٹے کے سیلِ رواں میں ہر شے ڈوب گئی

دل کہتا ہے — کاش کہیں سے چیختا پنچھی آئے
چاند کا کنگن، کالے بھیانک پربت پر گِر جائے
کنگن سے کرچیں اُڑ اُڑ کر بکھریں، دُور تک آئیں
جگمگ کرتے ننھے ننھے تارے بنتی جائیں

آسماں ، میدان جس میں ہو نہ گھاس
چاند جیسے کوئی چرواہا ، اُداس
پھیکا پھیکا سا تبسّم ، شب کے پاس

اِک صدا اور اِک صدائے بازگشت
ایک مَیں — اِک چاند کا بے رنگ طشت
منزلوں تک دل کا ہم دم ، ایک دشت

دشت ہے اور ریگ کا سیلِ رواں
سنگ ریزوں کی بکھرتی داستاں
ہر طرف — ارض و سما کے درمیاں

جنگل

گبھرے پیڑوں کے جنگل میں
پتّوں کی کالی دیواریں
دیواروں میں لاکھوں روزن
روزن ، آنکھیں ہیں جنگل کی
وحشی آنکھیں ہیں جنگل کی

تُو راہی ، انجان مسافر
جنگل کا آغاز نہ آخر
سب رستے ناپید ہیں اس کے
سب راہیں مسدُود سراسر

تُو راہی — جُگنو سا پیکر
ہار چُکا جنگل سے لڑ کر
اب آنسو کا دِیا جلائے
تُو — گُم کردہ راہ مسافر
ایسی پاگل نظروں سے کیوں
اَوجِ فلک کی پیشانی پر
جھلمِل کرتے اُس جھُومر کو
گھُور رہا ہے ؟؟

نوجوانی

سارے عالم پر ہے سناٹا محیط
دم بخود ہیں پیڑ چپ ہے کائنات
مسکراتی چاندنی کی گود میں
روتے روتے سو گئی معصوم رات

آسماں پر کہکشاں ، کھوئی ہوئی
خاک پر خاموش لاکھوں مرغزار
رہگذر سے ہٹ کے اِک برگد کا پیڑ

اپنی پرچھائیں سے گویا ہمکنار

پیڑ کے سائے میں دُو خاموش بُت
دو شگوفے، زیست کے سربستہ راز
دو دھڑکتے دِل، فنا سے بے خبر
آنے والی تیرگی سے بے نیاز

بلیک آؤٹ

زنگ آلود سائرن بولیں
تیز، بوجھل، مہیب آوازیں
ایک زخمی سی چیخ بن کے بہیں
چیخ کی لرزشوں سے ڈر ڈر کر
قہقہے مسکراتی آنکھوں کے
تیرگی کے سمندروں میں بجھیں
کھڑکیاں اپنی پلکیں جھپکائیں
چوک سے سیٹیاں انہیں ڈانٹیں
سرد، سنسان، دم بخود سڑکیں

چاپ کا انتظار کرتی رہیں
تیرگی، خامشی — بہم ہو کر
شہر کی تنگ ٹیڑھی گلیوں میں
بے خطر، بے دھڑک، چلی آئیں
گُل شدہ آنگنوں کو پار کریں
ٹمٹماتے دلوں پہ وار کریں
اور کواڑوں سے اپنا سر پھوڑیں

انجام

پھول تھا — مرجھا گیا!
بھیگی بھیگی چاندنی میں، بارشِ انوار میں
دیر تک گرتی رہیں آبِ رواں پر پتیاں
دیر تک قائم رہا مرگِ مسلسل کا سماں
جانے کیا ہوتا رہا!

اوس کی پریاں نسیمِ مشکبو کے دوش پر
پھر رہی ہیں دل گرفتہ، سرگراں، نوحہ کناں
اب کہاں ان کو ملے گا حشر تک اُس کا نشاں

خواب تھا — آیا، گیا!

پھول تھا — مرجھا گیا!
رات کے دُکھتے بدن کو گیت سے سہلا گیا
پھول تھا — مرجھا گیا!!

دھرتی کی آواز

بادلو! دھند کے مانند بکھرنا سیکھو
یہ بھی کیا اوجِ ثریا پہ گرجتے رہنا
زخمی چیتے کی طرح خود پہ بگڑتے رہنا
یا تو آنا ہی نہ دھرتی کی عیادت کیلئے
اور اگر آنا تو اِک برق سی بن کر آنا
کسی نادار کے خرمن کو جلانے کے لئے
کسی مفلس کی ٹھٹھرتی ہوئی کُٹیا کے قریب
اُس کے معصوم سے بچے کو بھسم کر جانا

بادلو! دُھند کے مانند بکھرنا سیکھو
اِک ردا بن کے بکھر جاؤ مری دنیا پر

اپنے دامن میں چھپالو میرے سب بچوں کو
یہ بلکتے ہُوئے، ہنستے ہوئے معصوم سے لوگ
جن کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں، زر و سیم کا بار
یوں بکھر جاؤ کہ اک دل کو بھی محسوس نہ ہو
ہم سفر کتنے کھلونوں کا بنا ہے مالک
کہ زر و سیم کی تقسیم کا یہ جُرم، فریب
میرے بچوں کی ہلاکت کا بنا ہے موجب
بادلو! آؤ، اُترآؤ مری دُنیا پر![1]

[1] یہ نظم پہلی بار "ساقی" میں نصرت آرا نصرت کے فرضی نام سے چھپی تھی!

یاد

خزاں نصیبوں کی انجمن میں
یہ مست جھونکا کہاں سے آیا؟

کہاں سے آیا، کسے خبر ہے
مگر یہی ہر زبان پہ ہے:
ہوا کا جب بے قرار جھونکا
خزاں کی بے نور انجمن سے
لگا بڑے ناز سے گذرنے
تو سوکھے پیڑوں نے سر اٹھا کر
نحیف بازو ہلا ہلا کر

خزاں کے اس شوخ میہماں پہ
سنبھلتے، گرتے، ہزاروں پتّے
کیے بڑی دیر تک نچھاور!

گزر چکا ہے ہوا کا جھونکا
روش روش پر ہیں غم کے مارے
خزاں کے ٹوٹے ہوئے سہارے

انسان

اوس کی طرح نبک، پھول کے مانند حسیں
اُڑتے بادل کی طرح صبح کہیں، شام کہیں
ایک نغمہ جسے اب تک کوئی سمجھا ہی نہیں

منتظر، صبحِ پُر انوار کا، ہنگامِ سحر
نکلے خورشید اسے خاک بھی آئے نہ نظر
علم کی آخری حد، جہل کا تاریک نگر

شام جھکے تو ملائم سے اندھیرے آئیں
چھنکے پازیب، تھرکتے ہوئے تارے گائیں
دل کی مردنگ بجے، نیر برستے جائیں

سرِ راہ

شب کی محفل میں ہیں دو چار ستارے، خاموش
ان سے کچھ دُور، بئے پہلو میں قلبِ مجبور
اِک تھکا ہارا سا مہتاب، اکیلا تنہا
وہی مجھ ایسا مقدّر، وہی مجھ سا مجبور

دلِ ناشاد! تجھے یاد نہ ہوگا شاید
ہم اِک رات ستایا تھا حسیں تاروں کو
کوہ کے پار سے جب اُبھرا تھا بیتاب سا چاند
ہم نے اِک گیت سنایا تھا سمن زاروں کو

اور اُس گیت کی اِک لرزشِ بے نام کے ساتھ

ناچ ناچ اُٹھتے تھے کرنوں کے سُنہری دھارے
مسکراتی ہوئی وادی کے تھرکتے جھرنے
نقرئی جھانجھنیں پہنے ہوئے نازک تارے

آج اِس وادیٔ پُرنور کی ہر شے ہے اُداس
مضمحل چاند، بجھے پیڑ، ستارے بے دم
آج تھک ہار کے بیٹھا ہے سرِ راہ کوئی
آسماں دُور، زمیں سخت، فضا نامحرم!

تخلیق

کیا جرم تھا یہ میرا!
جب رات نے دم توڑا
جب تاروں نے رو رو کر
آکاش سے مُنہ موڑا
جب چاند کے بجرے نے
مغرب کی چٹانوں میں
کرنوں کے سمندر کو
دم بھر کے لئے چھوڑا
جب صبح نے مسکا کر
چمکیلا گھر اپنا

قاصد کے بارے میں
پھولوں کی طرف بھیجا
میں ساتھ چلا آیا
کیا جرم تھا یہ میرا؟

نئی پود

خزاں کے پنچھی برہنہ شاخوں پہ جھولتے ہیں!

بہار کب کی گزر چکی ہے
بہار کے خوش گلو مغنّی
دمکتی صبحوں کے گیت گاتے
اُداس شاموں پہ مسکراتے
لچکتی شاخوں، سمٹتے غنچوں، لجاتی کلیوں کو گدگداتے
نجانے کس سمت جا چکے ہیں!

چمن کے آتش نوا پرندے نجانے کس سمت جا چکے ہیں

خزاں کے آوارہ حال پنچھی شکستہ معبد کو پوجتے ہیں
برہنہ شاخوں پہ جھولتے ہیں!!

حیاتِ نَو

نقرئی سکوں میں ڈھلتے ہوئے یہ شام و سحر
ایک بے نور اُداسی کی گپھا میں چپ چاپ
نرم بوندوں کی طرح گرتے چلے جاتے تھے

ہر نئی شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں
اِک ستارہ اُبھر آتا تھا فلک پہ چپ چاپ
دو ستارے میری آنکھوں میں بھی لہراتے تھے

ہر شب تیرہ کے انجام پہ دونوں آنسو
میری آنکھوں کے جھروکوں سے نِکل کر چپ چاپ

میرے گالوں پہ لڑھکتے ہوئے کھو جاتے تھے

آج میں اک نئی چہکار سے جاگ اٹھا ہوں
قہقہہ — ننھی سی گڑیا کا، در آیا چپ چاپ
اور میں خوابِ گرانبار سے جاگ اٹھا ہوں

تعاقب

تری یاد

اِک زخم خوردہ سے آہو کے مانند تھک ہار کر گر پڑی ہے

کسی کانپتے، لڑکھڑاتے ہُوئے پاؤں کی چاپ جیسے

بہت ہولے ہولے

کسی سرد پتھر پہ جا کر رُکے، پھر نہ اُبھرے

وہ پتھر جو اِک گہرے پُرہول کھڈ کے دہانے پہ گردن جھکائے

ازل سے کھڑا ہو!

نجانے میں اس کالے بے جان پتھر پہ کب سے کھڑا ہوں

مرے سامنے اِک بھیانک خَلا ہے

خَلا — جو تری یاد کو کھا گیا ہے!!

بے وفا

دِل اِک سُوکھا پتّا جس نے شاخ سے ناتا توڑا
اپنوں سے منہ موڑ کے جس نے تجھ سے رشتہ جوڑا

سُوکھا پتّا، شاخ سے ٹوٹا اب تو اُسے اُڑائے گی
جہاں بھی تیرا جی چاہا تو ساتھ اسے لے جائے گی
روش روش پہ، گلی گلی میں، کیا کیا ناچ نچائے گی
دیواروں سے دے مارے گی، پاؤں سے ٹھکرائے گی
پنکھ اس کے جب جھڑ جائیں گے تو آگے بڑھ جائیگی

دِل اِک سُوکھا پتّا جس نے شاخ سے ناتا توڑا!
چھوڑ اپنوں کو اس پاگل نے کس سے رشتہ جوڑا

رُکنے کے بعد

ذرا دیر کو میں رُکا تھا کہ اِک شاخ ٹوٹی
پرندا کوئی ڈر کے چیخا
گھنی، سرسراتی ہوئی جھاڑیوں سے
کوئی شوخ کتا سانپ لہرا کے نکلا
جھکی ڈال اِک دل جلے پیڑ کی کسمسائی
کہیں دُور جھینگر نے بنسی بجائی
اندھیرا ہوا اور بھی کچھ گھنیرا
لرزنے لگا خوف سے جسم میرا!

میں بڑھتے ہوئے تند، پُرشور سیلاب کا ہم نوا تھا

مگر آج اِک گہری کھڈ میں گرا ہوں — رُکا ہوں
کف آلود لہروں کے سیلِ بلاخیز سے کٹ گیا ہوں
تو اِس ٹین کے جسم کی چھت پہ گرتی ہوئی
ایک اِک بوند سے آشنا ہوں !!

ندامت

تب ترے لب پہ تبسّم کی کرن لہرائی
سرمگیں پلکیں اٹھیں لرزشِ موہوم کے ساتھ
مدھ بھری آنکھوں کی نِتھری ہوئی گہرائی سے
دو چمکتے ہوئے، ہنستے ہوئے، تارے اُبھرے
اِک نے مژگاں کے چمن زار کو سیراب کیا
دوسرا خار سے دامن کو چھڑا کر ٹپکا
خاک پہ میری طرح گر کے رہا — گِر کے رہا

اب جو میں وقت کی بے رحم سی اِک موج کے ساتھ

کسی کاغذ کے کھلونے کی طرح بہتا ہُوا
دم بدم تند ہواؤں کے تھپیڑے سہتا
ایک پَل کے لیے پتھر کے جزیرے پہ رُکا
تو مجھے پھیلی ہوئی رات کی تاریکی میں
اُس ترے پہلے ستارے کی بہت یاد آئی

کاش میں تیری مسرت کو جواں رکھ سکتا
کاش میں تیرے تبسّم کو سہارا دیتا
تا ابد تیری نگاہوں میں لرزتا رہتا

ننّھے مزدور

شب گزری اور سورج نکلا ہو گیا عالم بقعۂ نور
سوئے تارے، جاگے پنچھی، وہ قیدی تھے یہ مزدور

باؤ چلی لہرائے پتّے، اُڑ گئے پنچھی کوسوں دُور
پورب، پچھم، اُتّر، دکّن، چاروں اُور گئے مزدور

سُونے ہو گئے رین بسیرے، کھیت ہُوئے سارے بھرپُور
ہر دہقاں کے ہل کے پیچھے رقص کناں ننّھے مزدُور

روزی دن کی آج ملے بس یہ ان کی فریاد
دہقاں کو ہے غم فردا کا، یہ اس سے آزاد

یہ لوگ

اُونچے پیڑوں کے زرد رُو پتّے
اِتنے غم دیدہ اِتنے راندے ہُوئے
بات تک بھی مری نہیں سُنتے!

پاؤں کی چاپ سے لرزتے ہیں
نرم آہٹ پہ کانپ اُٹھتے ہیں
سہما جھونکا بھی گر گزر جائے
لڑکھڑاتے ہیں، گرنے لگتے ہیں
جیسے بارانی رات کے موتی

جیسے آنسو کسی مسافر کے

پیڑ ذوقِ نمو میں کھوئے ہوئے
منتظر ہیں نئے شگوفوں کے
زرد پتوں سے اِن کو پیار نہیں

زرد پتوں کو کوئی سمجھائے
یہ مری بات ہی نہیں سُنتے!

چاپ

یہاں — اب سے کچھ دیر پہلے
سیہ، زنگ آلود پہیّوں کے رُکتے سنبھلتے ہوئے شور میں
زرد آوارہ کتّے کی آواز
سینے کے زندان کو توڑ کر
ایک قیدی کے مانند باہر کو اُڑنے لگی تھی!
وہ گھائل، سسکتی ہوئی چیخ
اب لاکھوں کرچوں میں بٹ کر، کراہوں میں ڈھل کر
نگاہوں کے عرقوں میں خنجر چھپائے
اندھیرے کے پُر ہول بن کی تہوں میں اُترنے لگی ہے

اُترتی بیلی جا رہی ہے

میں اِس اندھی آواز سے بچ نکلنے کی خاطر
ہزاروں جتن کر چکا ہوں
دہکتی ہوئی سانس کو اپنے سینے میں روکے
لہو سے تہی، برف سی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونسے
اندھیرے کے جنگل میں دبکا پڑا ہوں
مگر کیا کروں
اس — تعاقب میں آتی ہوئی چاپ کو کیا کروں؟

نارسائی

آنکھ مچولی کھیلتے تاروں کی سن کر جھنکار
کچی نیند سے رات کی رانی جاگ اٹھی یکبار
تاروں نے دم سادھ لیا بُت بن گئے سب اشجار

گجرے پہنے، بال سنوارے چپل دیئے اُتار
سندر آنچل سر پہ لے کر ہو گئی وہ تیار
ننگے پاؤں جھینپتی ڈرتی چلی پیا کے دوار

اِک پتھر پہ اکڑوں بیٹھا سوچ رہا ہوں یار!
رات بچاری ہر شب یونہی ہوتی ہے تیار
آخر میں اِک بھیگا آنچل اور اشکوں کے ہار

شبِ یلدا

عجیب شب تھی!
فلک کی زرد اور سست رو ناؤ کا بھی کوئی نشاں نہیں تھا
سجیلے تاروں کی محفلیں بھی کہیں نہیں تھیں
دمکتے جگنو، لرزتی شمعیں — کوئی نہیں تھا
عجیب شب تھی کہ نور کے سارے سیم پارے
کنارہ کش ہو گئے تھے جیسے
ندی کنارے، ہم ایک میداں میں مہر بر لب
اُداس و حیران و دل گرفتہ، یہ سوچتے تھے
نجانے کب کوئی سیم پیکر

مہیب شب ہے، اڑے گا آگر ہماری خاطر!

عجیب شب تھی

طویل اِتنی کہ آج بھی ہم اسی کے زنداں میں دم بخود ہیں

سیاہ ایسی کہ اب بھی ہم کو کسی سہارے

کسی دمکتے ہوئے ستارے کی آرزو ہے!

نروان

مری سانس کا سلسلہ
ایسے ٹوٹے — کہ اک مست جھونکے کی مانند گرتی لڑھکتی ہوئی عمر میری
ہری، لانبی، مخمل سی، خوشبو بھری گھاس میں
اپنے ننگے بدن کو اتارے
نہ آنسو گرائے نہ دامن پسارے
فقط ہاتھ کے الوداعی اشارے سے
اپنے تعاقب میں آتے پرندوں کو رخصت کرے
اور خود گھاس کی جھیل میں ڈوب جائے!

مری سانس کا سلسلہ

یوں نہ ٹوٹے — کہ اِک تند جھونکے کی مانند اُڑتی ہوئی عمر میری
کسی بند، اُجڑے ہوئے شہر میں دفعتاً خود کو پائے
بھیانک خموشی کا اِک ڈولتا قہقہہ
اُس کی رگ رگ میں اُترے — تو وہ بوکھلائے
قطاروں میں لیٹی ہوئی مُردہ گلیوں میں بھٹکے
مکانوں میں اُترے، منڈیروں پہ آئے
سیہ چھوٹی اینٹوں کی فرسودہ دیوار کو اپنی پوروں سے چھُو کر
کوئی درز ڈھونڈے، کوئی راہ مانگے
اچانک کسی سرد کھمبے کی بے نُور آنکھوں سے جھانکے
بڑے کرب سے گڑگڑائے
"خدارا کوئی مجھ کو باہر نکلنے کا رستہ بتائے
خدارا کوئی مجھ کو باہر نکلنے کا رستہ بتائے"

فن کار سے!

کیوں تم ہر ویران گلی میں پھرا کئے نادان
کیوں تم ہر دہلیز سے لگ کر کھڑے رہے حیران

تم پہ بچھ سے اِن سُونی سُونی گلیوں میں دن رین
کبھو کسی نے ڈالا بھی دل کے کشکول میں دان

تم تنہا تھے، تم تنہا ہو، یہاں تمہارا کون
کون ایسا ہے اس جگ میں تم کرو گے جس پہ مان

شہر کے باہر الھڑ جھونکے خوشبوئیں اور رنگ

شہر کے اندر گھپ اندھیارا اور جلتے شمشان

جل جاؤ تم آگ میں لیکن بجھے نہ من کی آگ
اس قندیل سے ملتا جائے سب کو نور کا دان

Scanned by CamScanner

ترتیب

دھرتی کی آواز	۱۹۴۶ء	آخرِ شب	۱۹۵۵ء
نوجوانی	۱۹۴۸ء	من و تُو	۱۹۵۶ء
تخلیق	۱۹۴۸ء	بازگشت	۱۹۵۶ء
دائرہ	۱۹۵۱ء	انجام	۱۹۵۶ء
ندامت	۱۹۵۱ء	میں اور تُو	۱۹۵۷ء
یاد	۱۹۵۲ء	اکیلا	۱۹۵۷ء
سرِ راہ	۱۹۵۲ء	فن کار سے!	۱۹۵۷ء
یہ لوگ	۱۹۵۳ء	تعاقب	۱۹۵۷ء
ننھّے مزدور	۱۹۵۳ء	زندگی	۱۹۵۸ء
حیاتِ نَو	۱۹۵۴ء	پُرانی بات	۱۹۵۸ء
نئی پَود	۱۹۵۴ء	جنگل	۱۹۵۸ء
آوارہ	۱۹۵۴ء	انسان	۱۹۵۸ء
شبِ یلدا	۱۹۵۵ء	مسرّت	۱۹۵۸ء
قریب و دور	۱۹۵۵ء	پت جھڑ	۱۹۵۹ء

پیپل	۱۹۵۸ء	نیا سال	۱۹۶۲ء
عکس	۱۹۵۸ء	نارسائی	۱۹۶۲ء
رات	۱۹۵۸ء	سرپھرا	۱۹۶۲ء
بات	۱۹۶۰ء	جسم	۱۹۶۳ء
جب اور اب	۱۹۶۰ء	دُکھ	۱۹۶۲ء
شام	۱۹۶۰ء	چمکتا لمحہ	۱۹۶۲ء
عشق	۱۹۶۰ء	بلیک آؤٹ	۱۹۶۳ء
طلسم	۱۹۶۰ء	جیل	۱۹۶۳ء
بلاوا	۱۹۶۰ء	گوری اور کالی	۱۹۶۳ء
پیار	۱۹۶۰ء	اُجڑتا شہر	۱۹۶۳ء
فرازِ کوہ	۱۹۶۱ء	تہذیب	۱۹۶۳ء
بے وفا	۱۹۶۱ء	عفریت	۱۹۶۳ء
ملاقات	۱۹۶۱ء	اعتراف	۱۹۶۳ء
سفر	۱۹۶۱ء	مشورہ	۱۹۶۳ء
اجنبی	۱۹۶۱ء	چاپ	۱۹۶۴ء
واپسی	۱۹۶۱ء	رکنے کے بعد	۱۹۶۴ء

نروان ۱۹۶۴ء

اردو کے منفرد شاعر اور بالغ نظر نقاد
ڈاکٹر وزیر آغا
نقدالاب کے میدان میں ایک اجتہادی کارنامہ سر انجام دیتے ہیں
اردو شاعری کا مزاج
ثقافتی، تہذیبی ارو تاریخی پس منظر میں اردو شاعری کی تین اہم اصناف کا ایک اچھوتے زاویہ نگاہ سے مطالعہ ــــــ جو اردو تنقید کو ایک بالکل نیا موڑ عطا کر دے گا اور جسکا حوالہ دیئے بغیر مستقبل کے کسی ادبی ناقد کے لئے آگے بڑھنا ناممکن ہو گا !
(زیر طبع)
جدید ناشرین
پبلشرز، سٹیشنرز، چوک اردو بازار ○ لاہور